ALLAMA IQBAL OPEN UNIVERSITY

USMAN NOTES
www.usmannotes.com

Name:

Registration No.:

Course Code: 433

Program: B.A

Semester: Autumn 2026

علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

کورس: اقبال کی فارسی شاعری (433) • سطح: بی۔اے

سمسٹر: خزاں 2026

امتحانی مشق نمبر 1 (یونٹ: 1 تا 4)

کل نمبر: 100 • کامیابی کے نمبر: 40

حل شدہ اسائنمنٹ گائیڈ

(مطالعہ و حوالہ کے لیے)

USMAN NOTES www.usmannotes.com

نوٹ: یہ گائیڈ صرف مطالعہ اور حوالے کے مقصد کے لیے تیار کی گئی ہے۔ طلبہ کو مشورہ دیا جاتا ہے کہ وہ کورس کی کتاب کے متعلقہ یونٹس غور سے پڑھیں، تصورات کو اچھی طرح سمجھیں اور اسائنمنٹ اپنے الفاظ میں تحریر کریں۔

سوال نمبر 1: درج ذیل سوالات کے مختصر جواب (20 نمبر)

سوال نمبر 1۔(الف) درج ذیل سوالات کے مختصر جواب تحریر کیجیے۔(20)

تعارف

علامہ اقبال کی فارسی شاعری کا مطالعہ محض زبان و ادب کا مطالعہ نہیں بلکہ ایک عظیم مفکر کی فکر، اس کے اساتذہ، اس کی کتب اور اس کے فلسفۂ خودی و عشق سے واقفیت کا ذریعہ ہے۔ ذیل کے مختصر سوالات اسی بنیادی واقفیت کو جانچتے ہیں۔ ہر سوال کا جواب مختصر مگر مدلل انداز میں دیا گیا ہے تاکہ طالب علم نہ صرف نام اور تاریخ یاد کرے بلکہ اس کے

پس منظر اور اہمیت کو بھی سمجھ سکے۔ یہ سوالات یونٹ ایک تا چار کے اہم نکات کا احاطہ کرتے ہیں، جن میں اقبال کی سوانحی جھلکیاں، فارسی کتب، مثنوی و غزل کی اصناف اور مشاہیر ادب سے اقبال کے تعلق جیسے موضوعات شامل ہیں۔

1۔ مغربی تعلیم و تہذیب کے بارے میں اقبال سے متعلق خیالات کس کے ہیں؟

سوال میں نقل کردہ جملہ کہ مغربی تعلیم و تہذیب کے سمندر میں ندم رکھے وقت اقبال جتنا مسلمان تھا، اس کے منجھدھار میں پہنچ کر اس سے زیادہ مسلمان پایا گیا، مولانا سید سلیمان ندوی کے مشہور خیالات ہیں۔ اس جملے کا مفہوم یہ ہے کہ اقبال نے یورپ میں قیام کے دوران مغربی تہذیب کو قریب سے دیکھا، مگر اس کی چمک دمک ان کے ایمان کو متزلزل نہ کر سکی، بلکہ ان کا اسلامی شعور اور بھی پختہ ہو گیا۔ یہ بات اقبال کی فکری استقامت اور دین حمیت کی سب سے بڑی دلیل سمجھی جاتی ہے۔

2۔ اقبال فن برائے فن کے قائل تھے یا فن برائے زندگی کے؟

اقبال فن برائے زندگی کے قائل تھے۔ ان کے نزدیک شاعری محض لفظی بازی گری، عیش خیال یا وقت گزاری کا نام نہیں، بلکہ زندگی کی تعمیر، ملت کی بیداری اور انسان کی خودی کی تربیت کا ذریعہ ہے۔ انہوں نے اس فن کو بے مقصد قرار دیا جو انسان کو غفلت، مایوسی اور بے عملی کی نیند سلا دے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں پیغام، حرکت اور جہدِ مسلسل کو مرکزی مقام حاصل ہے اور وہ شاعر کو قوم کا معمار سمجھتے ہیں۔

3۔ مثنوی "پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق" کب شائع ہوئی؟

مثنوی "پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق" 1936ء میں شائع ہوئی۔ یہ اقبال کی آخری دور کی اہم فارسی مثنوی ہے جس میں انہوں نے مشرقی اقوام، خصوصاً مسلمانوں کی زبوں حالی کا تجزیہ کیا ہے اور ان کے لیے عمل کا لائحہ پیش کیا ہے۔ اس مثنوی میں اقبال نے مغرب کی مادی ترقی اور مشرق کی روحانی میراث کا موازنہ کرتے ہوئے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ اقوامِ شرق کی نجات اپنی خودی کی پہچان اور قرآنی اصولوں کی طرف رجوع میں ہے۔

4۔ اقبال کے خیالی سفر افلاک کی روداد کس عنوان سے شائع ہوئی؟

اقبال کے خیالی سفر افلاک کی روداد "جاوید نامہ" کے عنوان سے شائع ہوئی۔ یہ اقبال کی شاہکار فارسی مثنوی ہے جس میں شاعر مولانا روم کی رہنمائی میں افلاک کی سیر کرتا ہے اور مختلف مدارج و مقامات سے گزرتا ہوا عرشِ الٰہی تک پہنچتا ہے۔ اس سفر میں اقبال کی ملاقات ماضی کی عظیم شخصیات سے ہوتی ہے اور وہ اپنے فلسفۂ خودی، عشق اور مردِ مومن کے تصورات کو تمثیلی انداز میں پیش کرتے ہیں۔ یہ کتاب اپنے بیٹے جاوید کے نام سے منسوب ہے۔

5۔ مولوی میر حسن کون تھے؟

مولوی میر حسن اقبال کے استاد تھے۔ وہ سیالکوٹ کے مشہور عالم اور فارسی و عربی کے جید استاد تھے جن سے اقبال نے ابتدائی تعلیم حاصل کی اور فارسی زبان و ادب کا ذوق پایا۔ میر حسن کی شاگردی نے اقبال کے دل میں فارسی ادب، خصوصاً رومی و حافظ کے کلام کی محبت پیدا کی۔ اقبال عمر بھر اپنے اس استاد کا احترام کرتے رہے اور حکومت نے میر حسن کو "شمس العلماء" کے خطاب سے بھی نوازا تھا۔ اقبال کی فارسی شاعری کی بنیاد اسی استاد کی تربیت پر قائم ہے۔

6۔ نکلسن نے اقبال کی کس فارسی کتاب کا ترجمہ کیا؟

پروفیسر آر۔ اے۔ نکلسن نے اقبال کی فارسی مثنوی "اسرارِ خودی" کا انگریزی ترجمہ کیا جو "The Secrets of the Self" کے نام سے 1920ء میں شائع ہوا۔ اسی ترجمے کے ذریعے اقبال کی فکر مغربی دنیا تک پہنچی اور یورپ کے علمی حلقوں میں ان کی شہرت کی بنیاد پڑی۔ نکلسن نے اقبال کو مشرق کا عظیم مفکر شاعر قرار دیا۔ یہ ترجمہ اقبال کی عالمی پذیرائی کا نقطۂ آغاز ثابت ہوا اور آج بھی اسرارِ خودی کے مطالعے میں اس کی اہمیت مسلم ہے۔

7۔"نوادرات" کے مصنف کا نام بتایئے۔

"نوادرات" کے مصنف کے طور پر کورس میں فارسی ادب کے مشہور ذخیرۂ حکایات ولطائف کے مرتب کا نام لیا جاتا ہے، جس کی تحریروں سے فارسی نثر کی سادگی اور حکمت کا اندازہ ہوتا ہے۔نوادرات سے مراد نادر ونایاب باتیں، حکایتوں اور اقوال کا مجموعہ ہے۔اقبال کے مطالعے میں ایسی کتب کی اہمیت یہ ہے کہ فارسی ادب کی روایت صرف شاعری تک محدود نہیں، بلکہ اس میں حکمت، اخلاق اور تہذیبی شعور کی ایک طویل روایت بھی شامل ہے، جس سے اقبال نے بھرپور استفادہ کیا۔

8۔اقبال کی زیادہ فارسی غزلیں ان کی کن کتابوں میں ہیں؟

اقبال کی زیادہ فارسی غزلیں "پیامِ مشرق" اور "زبورِ عجم" میں ہیں۔پیامِ مشرق 1923ء میں شائع ہوا اور یہ گوئٹے کے مغربی دیوان کے جواب میں لکھا گیا، جبکہ زبورِ عجم 1927ء میں شائع ہوا جس میں غزلیات کے ساتھ مثنویات گلشنِ رازِ جدید اور بندگی نامہ بھی شامل ہیں۔ان دونوں مجموعوں کی غزلوں میں اقبال نے روایتی غزل کے حسن کو اپنی فکر، یعنی خودی، عشق اور حرکت کے پیغام سے ہم آہنگ کیا، جس سے فارسی غزل کو نیا رخ ملا۔

9۔"تشبیب" کسے کہتے ہیں؟

تشبیب قصیدے یا طویل نظم کے اس ابتدائی حصے کو کہتے ہیں جس میں شاعر اصل موضوع سے پہلے حسن وعشق، بہار، محبوب یا ماحول کا ذکر کرتا ہے۔تشبیب کا مقصد سامع کی توجہ حاصل کرنا اور ذہن کو اصل مدح یا مقصد کے لیے تیار کرنا ہوتا ہے۔فارسی اور اردو قصیدہ نگاری میں تشبیب کو بڑی اہمیت حاصل رہی ہے۔اقبال کے کلام میں بھی جہاں طویل نظمیں ہیں، وہاں ابتدائی تمثیلی وجمالیاتی حصے اسی روایت کی جھلک پیش کرتے ہیں، اگرچہ انہوں نے اسے مقصدیت سے خالی نہیں رکھا۔

10۔ "فصلِ بہار" اقبال کے کس مجموعۂ کلام میں شامل ہے؟

"فصلِ بہار" اقبال کے فارسی مجموعۂ کلام "زبورِ عجم" میں شامل ہے۔ اس نظم میں اقبال نے بہار کی آمد کو زندگی، تازگی اور بیداری کی علامت کے طور پر پیش کیا ہے۔ بہار ان کے ہاں محض موسم کا نام نہیں، بلکہ ملت کی نشاۃِ ثانیہ اور غفلت کی خزاں کے خاتمے کا استعارہ ہے۔ زبورِ عجم کی نظموں اور غزلوں میں فطرت کے مناظر ہمیشہ کسی نہ کسی فکری پیغام سے جڑے ہوتے ہیں، اور فصلِ بہار اس کی خوبصورت مثال ہے۔

11۔ سفر افلاک میں اقبال کا راہ نما کون تھا؟

جاوید نامہ کے سفر افلاک میں اقبال کے راہ نما مولانا جلال الدین رومی تھے۔ اقبال رومی کو اپنا مرشد اور پیشوا مانتے تھے اور انہی کی رہنمائی میں وہ فلکِ قمر سے آغاز کر کے مختلف افلاک کی سیر کرتے ہیں۔ رومی ہر مقام پر اقبال کے سوالات کے جواب دیتے اور اسرارِ خودی کی وضاحت کرتے ہیں۔ یہ رہنمائی محض ادبی حوالہ نہیں، بلکہ اقبال کے اس عقیدے کا اظہار ہے کہ رومی کی فکر ہی جدید مسلمان کی روحانی رہنمائی کر سکتی ہے۔

12۔ مثنوی کا خاص وصف کیا ہے؟

مثنوی کا خاص وصف یہ ہے کہ اس میں ہر شعر کے دونوں مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں اور قافیہ ہر شعر میں بدل جاتا ہے، اس لیے اس میں طویل داستانی، تعلیمی اور فلسفیانہ مضامین تسلسل کے ساتھ بیان کیے جا سکتے ہیں۔ یہی آزادی مثنوی کو رزمیہ، عشقیہ اور صوفیانہ قصوں کے لیے موزوں ترین صنف بناتی ہے۔ فارسی میں رومی کی مثنوی اس صنف کی معراج ہے، اور اقبال نے اسرارِ خودی، رموزِ بے خودی اور جاوید نامہ جیسی مثنویوں سے اسی روایت کو آگے بڑھایا۔

13۔"خطاب بہ جاوید" اقبال کی کس کتاب میں شامل ہے؟

"خطاب بہ جاوید" اقبال کی کتاب "جاوید نامہ" میں شامل ہے۔اس خطاب میں اقبال نے اپنے بیٹے جاوید اور اس کے واسطے سے پوری نوجوان نسل کو مخاطب کیا ہے۔اس میں وہ نوجوانوں کو خودی کی حفاظت، عشقِ رسول، محنت اور مسلم نہذیب کی اندھی تقلید سے بچنے کی تلقین کرتے ہیں۔ خطاب بہ جاوید دراصل اقبال کے تعلیمی و تربیتی افکار کا خلاصہ ہے اور اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اقبال اپنی فکر کا وارث نوجوان نسل ہی کو سمجھتے تھے۔

14۔"شعر العجم" کے مصنف کا نام بتایئے۔

"شعر العجم" کے مصنف علامہ شبلی نعمانی ہیں۔ یہ کتاب فارسی شاعری کی تاریخ اور تنقید پر اردو کی معرکہ آرا تصنیف ہے جس میں شبلی نے فارسی شعراء کے کلام کا تنقیدی جائزہ لیا ہے۔ شبلی کی اس کتاب نے برصغیر میں فارسی ادب کے مطالعے کو سائنسی بنیاد فراہم کی۔ اقبال شبلی کے علمی مقام کے معترف تھے اور ان کی تحریروں سے فارسی شاعری کی روایت کو سمجھنے میں اس نسل کے اہلِ علم نے بڑا فائدہ اٹھایا۔

15۔سلطان مظفر بیگڑہ کہاں کا حکمران تھا؟

سلطان مظفر بیگڑہ گجرات کا حکمران تھا۔ اس کا اصل نام محمود بیگڑہ تھا اور وہ گجرات کے سلطان محمود شاہ اول کے لقب سے مشہور ہوا۔ اس کے عہد میں گجرات علم و ادب اور فارسی تہذیب کا مرکز بنا۔ فارسی شاعری و ادب کی تاریخ میں گجرات کے دربار کا ذکر اس لیے آتا ہے کہ یہاں فارسی زبان و ادب کو سرپرستی ملی اور کئی شعراء و علماء اس دربار سے وابستہ رہے۔ اقبال کے فارسی ادب کے تاریخی پس منظر میں ایسے مراکز کا مطالعہ شامل ہے۔

16۔ "گلشنِ رازِ جدید" کس شاعر کے جواب میں لکھی گئی؟

"گلشنِ رازِ جدید" شیخ محمود شبستری کی مشہور فارسی مثنوی "گلشنِ راز" کے جواب میں لکھی گئی۔ شبستری نے اپنی کتاب میں تصوف کے سوالات کے جوابات دیے تھے؛ اقبال نے زبورِ عجم میں شامل اس مثنوی میں انہی سوالات کو اپنے فلسفۂ خودی کی روشنی میں نئے انداز سے حل کیا ہے۔ دونوں کتابوں کے موازنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اقبال تصوف کی اس روایت کو رد نہیں کرتے، بلکہ اسے عمل، خودی اور زندگی کی طرف موڑ کر اس کی اصلاح کرتے ہیں۔

17۔ سید ہجویر کا نام اور کنیت کیا ہے؟

سید ہجویر کا نام علی بن عثمان ہے اور ان کی کنیت ابوالحسن ہے۔ وہ حضرت داتا گنج بخش کے نام سے مشہور ہیں۔ ان کی تصنیف "کشف المحجوب" تصوف کی اولین فارسی کتابوں میں شمار ہوتی ہے۔ وہ غزنی کے محلہ ہجویر سے نسبت رکھتے تھے، اسی لیے ہجویری کہلائے۔ لاہور میں ان کا مزار مرجعِ خلائق ہے۔ اقبال کو داتا گنج بخش سے گہری عقیدت تھی اور جاوید نامہ و دیگر کلام میں ان کا ذکر احترام و محبت سے آتا ہے۔

18۔ موسیقیت کے اعتبار سے اقبال کن دو مشہور شعراء کے ساتھ جگہ پاتے ہیں؟

موسیقیت اور غنائیت کے اعتبار سے اقبال کو خواجہ حافظ شیرازی اور مرزا اسد اللہ خان غالب کے ساتھ جگہ دی جاتی ہے۔ حافظ کی غزل میں ترنم، کیف اور لفظوں کی موسیقی اپنے عروج پر ہے، اور غالب نے اردو و فارسی غزل کو فکری گہرائی کے ساتھ آہنگ عطا کیا۔ اقبال نے ان دونوں کی روایت کو اپنی فکر سے جوڑا؛ ان کے اشعار میں بحر و وزن کی پابندی کے ساتھ جوش، روانی اور اثر آفرینی پائی جاتی ہے، جس کی وجہ سے ان کا فارسی کلام بھی پڑھنے میں سرور و کیف کا تاثر دیتا ہے۔

19۔اقبال کے نزدیک منکرِ حق اور منکرِ خودی میں کون زیادہ کافر ہے؟

اقبال کے نزدیک منکرِ خودی، منکرِ حق سے زیادہ کافر ہے۔ ان کا مشہور تصور ہے کہ خودی کی پہچان ہی خدا کی پہچان کا دروازہ ہے؛ جو انسان اپنی خودی، یعنی اپنی حقیقت، صلاحیت اور مقام کو نہیں پہچانتا، وہ خدا کی معرفت تک بھی نہیں پہنچ سکتا۔ اسی لیے اقبال نے خودی کے انکار کو غلامی، ذلت اور موت کے مترادف قرار دیا ہے۔ یہ نکتہ ان کے پورے فلسفے کی بنیاد ہے اور اسرارِ خودی میں اس کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔

20۔اقبال کو قرآن پڑھنے کی یہ نصیحت کس نے کی تھی؟

اقبال کو یہ نصیحت کہ "جب تم قرآن پڑھو تو سمجھو کہ یہ تم پر ہی اترا ہے" ان کے والدِ گرامی شیخ نور محمد نے کی تھی۔ اقبال خود بیان کرتے ہیں کہ ان کے والد نے انہیں قرآن اس انداز سے پڑھنے کی تلقین کی کہ گویا وہ براہِ راست انہی پر نازل ہو رہا ہے۔ اس نصیحت نے اقبال کی زندگی بدل دی اور قرآن کی فکر کا سرچشمہ بن گیا۔ بعد میں اقبال نے کہا کہ اسی اندازِ مطالعہ نے ان پر قرآن کے اسرار کھولے اور ان کی شاعری کو قرآنی فکر کی روشنی عطا کی۔

حاصلِ کلام

حاصلِ کلام یہ ہے کہ یہ مختصر سوالات اقبال کی فارسی شاعری کے بنیادی نقشے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اقبال کا فن مقصدی تھا، ان کی بڑی فارسی کتب اسرارِ خودی، پیامِ مشرق، زبورِ عجم اور جاوید نامہ ہیں، ان کے مرشد رومی اور استاد میر حسن تھے، اور ان کی فکر کا مرکز خودی اور قرآن ہے۔ طالب علم اگر ان نکات کو پس منظر سمیت یاد کر لے تو آگے کے تفصیلی سوالات، یعنی ہیئت، غزل و مثنوی اور نوجوانوں کے نام اقبال کے پیغام کو سمجھنا اس کے لیے کہیں آسان ہو جائے گا۔ اسی لیے ان سوالات کو رٹے کے بجائے سمجھ کر یاد کرنا چاہیے۔

سوال نمبر 2: اقبال کی فارسی شاعری میں ہیئت کے تجربے (20 نمبر)

سوال نمبر 2۔ اقبال کی فارسی شاعری میں ہیئت کے تجربوں پر نوٹ تحریر کیجیے۔ (20)

تعارف

ہیئت سے مراد شعر کی ظاہری صورت، قالب اور صنفی ڈھانچہ ہے، یعنی شاعر اپنے خیال کو غزل میں ڈھالتا ہے، مثنوی میں، نظم میں یا رباعی و قطعے میں۔ اقبال کی فارسی شاعری کا ایک نمایاں وصف یہ ہے کہ انہوں نے محض پرانی ہیئتوں کی تقلید نہیں کی، بلکہ ہر ہیئت کو اپنے پیغام کے مطابق برتا اور کئی مقامات پر اس میں نئے تجربے بھی کیے۔ انہوں نے فارسی کی تقریباً تمام کلاسیکی اصناف کو آزمایا اور ہر صنف میں اپنی فکر کی مہر ثبت کی۔ اس نوٹ میں غزل، مثنوی، نظم اور دیگر اصناف میں اقبال کے ہیئتی تجربوں کا جائزہ لیا جاتا ہے۔

غزل میں تجربے

اقبال نے فارسی غزل کو اس کے روایتی دائرے، یعنی حسن و عشق، ساقی و میخانہ اور ہجر و وصال کی محدود دنیا سے نکال کر فلسفہ، خودی، ملت اور کائنات کے وسعت پزیر موضوعات سے آشنا کیا۔ پیامِ مشرق اور زبورِ عجم کی غزلوں میں مطلع، مقطع، قافیہ و ردیف کی پابندی برقرار ہے، مگر مضمون نیا ہے۔ کہیں وہ غزل کے اشعار کو باہم مربوط کر کے ایک مسلسل فکری وحدت بنا دیتے ہیں، جسے غزلِ مسلسل سے تعبیر کیا جا سکتا ہے، اور کہیں مقطعے میں تخلص کی روایت کو ترک کر کے براہِ راست پیغام دیتے ہیں۔ یہ تجربہ اس لیے اہم ہے کہ غزل جیسی ذاتی اور تاثراتی صنف میں اقبال نے اجتماعی اور فلسفیانہ فکر کو سمو دیا، اور غزل اپنی جمالیاتی لطافت کھوئے بغیر پیغام کی حامل بن گئی۔ نقادوں نے اسے فارسی غزل کی تجدید قرار دیا ہے۔

مثنوی میں تجربے

مثنوی اقبال کی پسندیدہ ہیئت ہے اور ان کی بڑی فارسی کتب اسی قالب میں ہیں۔ اسرارِ خودی اور رموزِ بے خودی میں انہوں نے رومی کی مثنوی کی بحر اور اسلوب کو اختیار کیا، مگر اس میں فلسفیانہ استدلال، حکایات اور مکالمے کو نئے انداز سے برتا۔ جاوید نامہ میں مثنوی تمثیلی سفر نامے کی صورت اختیار کر لیتی ہے، جس میں مناظر، کردار اور مکالمے ڈرامائی انداز میں پیش کیے گئے ہیں۔ یہ ہیئتی تجربہ مثنوی کو محض قصہ گوئی سے نکال کر فلسفیانہ ڈرامے کے قریب لے آتا ہے۔ اسی طرح پس چہ باید کرد میں مثنوی خطیبانہ و تحلیلی رنگ اختیار کرتی ہے۔ اقبال نے مثنوی کی طوالت کو اپنے پیغام کے لیے استعمال کیا، ہر حکایت کو نتیجے سے جوڑا، جس سے قاری فکر کی منزلیں طے کرتا چلا جاتا ہے۔

نظم اور دیگر اصناف میں تجربے

اقبال نے فارسی نظم میں بھی نئے موضوعات اور نئی ترکیبیں آزمائیں۔ زبورِ عجم اور پیامِ مشرق کی نظموں میں فطرت کے مناظر، تاریخی شخصیات اور مشرق و مغرب کے تقابلی مطالعے کو نظم کا موضوع بنایا گیا۔ انہوں نے فارسی میں رباعی، قطعہ اور مسدس جیسی نسبتاً کم استعمال ہونے والی ہیئتوں کو بھی برتا اور کہیں مکالماتی انداز اختیار کیا، جس میں دو کردار یا دو افکار آمنے سامنے ہوتے ہیں، جیسے عقل و عشق کا مکالمہ۔ مکالماتی ہیئت سے فلسفیانہ مسئلہ زندہ صورت میں سامنے آتا ہے اور قاری خود نتیجے تک پہنچتا ہے۔ اقبال کے ہاں تراکیب سازی و لفظ سازی بھی ہیئتی تجربے کا حصہ ہے؛ انہوں نے نئی تراکیب وضع کر کے فارسی زبان کے اظہار کو وسعت دی۔

زبان، بحر اور آہنگ کے تجربے

اقبال نے فارسی شاعری کی بحروں میں بھی وسعت اور روانی پیدا کی۔ وہ مشکل اور طویل بحروں کو بھی سہولت سے برتتے ہیں اور کہیں مامون و معروف بحروں میں جوش و خروش بھر دیتے ہیں۔ ان کے ہاں فارسی زبان سادہ بھی ہے اور پر شکوہ بھی؛ جہاں پیغام خطیبانہ ہے وہاں زبان میں تہدید و ترغیب کا رنگ ہے، اور جہاں تصوف و عشق کا ذکر ہے وہاں نرمی و گداز ہے۔ انہوں نے اردو اور فارسی کے فکری اسلوب کو قریب کر دیا، یعنی فارسی میں وہی موضوعات اور وہی جوش ہے جو ان کی اردو شاعری میں ہے۔ یہ دو لسانی وحدت بھی ان کا انفرادی تجربہ ہے، جس نے فارسی شاعری کو برصغیر کے قاری کے لیے قریب تر کر دیا۔

حاصلِ کلام

حاصلِ کلام یہ ہے کہ اقبال نے فارسی شاعری کی ہیئتوں کو جامد روایات کے طور پر نہیں لیا، بلکہ انہیں اپنے پیغام کی ترسیل کے زندہ ذرائع بنایا۔ غزل کو انہوں نے فلسفیانہ وسعت دی، مثنوی کو تمثیلی و مکالماتی ڈرامے کی طرف بڑھایا، نظم و رباعی کو نئے موضوعات سے جوڑا اور زبان و بحر میں تازگی پیدا کی۔ ان تجربوں کی کامیابی کا ثبوت یہ ہے کہ ان کی فارسی شاعری آج بھی تازہ محسوس ہوتی ہے اور اسے پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ پرانی ہیئت میں نیا خون دوڑ رہا ہے۔ طالب علم کے لیے سبق یہ ہے کہ ہیئت مقصد نہیں، وسیلہ ہے؛ اصل چیز وہ فکر ہے جس کے لیے ہیئت اختیار کی جاتی ہے۔

اس بحث کو مزید سمجھنے کے لیے یہ نکتہ ذہن میں رکھنا چاہیے کہ اقبال کے ہیئتی تجربے محض فنی شوق کا نتیجہ نہیں تھے، بلکہ ان کے پیغام کی ضرورت تھے۔ جب فکر نیا ہو تو پرانا قالب خود بخود اس کے لیے تنگ یا وسیع محسوس ہونے لگتا ہے۔ اقبال نے جہاں غزل میں مسلسل فکر بھری، وہاں انہوں نے یہ بتانا چاہتے تھے کہ مسلمان کی زندگی بھی منتشر نہیں، ایک مرکز سے جڑی ہوئی ہونی چاہیے۔ جہاں انہوں نے مثنوی میں مکالمہ داخل کیا، وہاں مقصد یہ تھا کہ تاریخی دلیل کو زندہ انسان کی زبان سے سنے اور خود فیصلہ کرے۔ جہاں انہوں نے نئی تراکیب بنائیں، وہاں مقصد یہ تھا کہ فارسی زبان جدید فلسفیانہ اور سائنسی دور کے تصورات کو بھی ادا کر سکے۔ اس زاویے سے ہیئتی تجربہ دراصل فکری تجربے کا ظاہری روپ ہے۔ ناقدین اسی لیے کہتے ہیں کہ اقبال کی شاعری میں صورت و معنی کو الگ نہیں کیا جا سکتا۔ طالب علم اگر اس ربط کو سمجھ کر مثالیں یاد کرے، جیسے پیامِ مشرق کی غزلِ مسلسل اور جاوید نامہ کی مکالماتی مثنوی، تو اس کا جواب محض فہرست نہیں رہے گا، بلکہ ایک مربوط تنقیدی مضمون بن جائے گا، اور یہی اس سوال میں ممتحن دیکھنا چاہتا ہے۔

مزید وضاحت: ہیئت اور فکر کا تعلق

سوال نمبر 3: نوجوان کی سید ہجویر سے شکایت اور ان کا جواب (20 نمبر)

سوال نمبر 3۔ نوجوان نے سید ہجویر سے کیا شکایت کی اور انہوں نے کیا جواب دیا؟ مفصل بیان کیجیے۔ (20)

تعارف

جاوید نامہ میں اقبال اپنے روحانی سفر کے دوران ماضی کی عظیم شخصیات سے ملاقات کرتے ہیں۔ انہی ملاقاتوں میں ایک اہم مکالمہ نوجوان اور حضرت سید علی ہجویری، المعروف داتا گنج بخش، کے درمیان پیش آتا ہے۔ یہ مکالمہ دراصل ہر دور کے نوجوان کے ذہنی سوالات اور ایک بزرگِ دین کی رہنمائی کا تمثیلی بیان ہے۔ نوجوان کی شکایت اس کی قوم کی حالت، تقدیر کے مسئلے اور عمل کی راہ سے متعلق ہے، جبکہ سید ہجویری کا جواب اقبال کے فلسفۂ خودی اور قرآنی فکر کا خلاصہ ہے۔ اس سوال میں اسی مکالمے کی تفصیل بیان کی جاتی ہے۔

نوجوان کی شکایت

نوجوان سید ہجویر کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنی اور اپنی قوم کی حالت کی شکایت کرتا ہے۔ اس کی شکایت کا خلاصہ یہ ہے کہ وہ زمان و زوال کا شکار ہے، اس کی قسمت میں ذلت و پستی لکھی ہوئی محسوس ہوتی ہے، وہ دوسروں کا محتاج ہے اور اس کی اپنی کوئی سعی و عمل کارگر نہیں ہوتی۔ نوجوان تقدیر کے مسئلے میں الجھا ہوا ہے؛ وہ سمجھتا ہے کہ جب سب کچھ تقدیر میں پہلے سے لکھا ہے تو کوشش کا کیا فائدہ؟ اس کے ساتھ اسے زمانے کی بے رحمی، اہلِ علم کی بے عملی اور قوم کی غفلت کا بھی گلہ ہے۔ یہ شکایت محض ایک کردار کی نہیں، بلکہ اقبال کے عہد کے ہر بیدار مغز نوجوان کی آواز ہے، جو قوم کی حالت دیکھ کر مایوس بھی ہے اور اس کا حل بھی چاہتا ہے۔

سید ہجویر کا جواب: تقدیر کی حقیقت

سید ہجویر نے نوجوان کی شکایت سن کر اسے تقدیر کے اصل مفہوم کی طرف متوجہ کیا۔ انہوں نے فرمایا کہ تقدیر کا مطلب یہ نہیں کہ انسان مجبور و مقید ہے اور اس کا عمل بے معنی ہے۔ اسلام کی تقدیر دراصل کائنات کے ان قوانین کا نام ہے جن کے اندر رہ کر انسان اپنی خودی کو پروان چڑھاتا ہے۔ جو قوم اپنی خودی کو مضبوط کرتی ہے، تقدیر خود اس کے حق میں بدلتی محسوس ہوتی ہے، اور جو خود کو چھوڑ دیتی ہے، وہی تقدیر کے نام پر روتی ہے۔ انہوں نے نوجوان کو سمجھایا کہ خدا نے انسان کو ارادے کی آزادی عطا کی ہے اور اسی آزادی کی بنیاد پر جزا و سزا کا نظام قائم ہے؛ لہٰذا تقدیر کو بے عملی کا بہانہ بنانا خود فریبی ہے۔

جواب کا عملی پہلو: خودی، عشق اور عمل

سید ہجویر کے جواب کا دوسرا پہلو عملی ہے۔ انہوں نے نوجوان کو تلقین کی کہ وہ اپنی خودی کو پہچانے، اللہ اور اس کے رسول سے عشق کا رشتہ مضبوط کرے اور جہدِ مسلسل کو اپنا شعار بنائے۔ ان کے نزدیک نجات کتابی بحثوں میں نہیں، بلکہ عمل میں ہے؛ جو قوم قرآن کو محض تلاوت کی کتاب بنالے اور اس کے احکام کو زندگی میں نہ لائے، وہ شکایت ہی کرتی رہتی ہے۔ انہوں نے یہ بھی واضح کیا کہ بزرگوں کی خانقاہیں اور ان کی تعلیمات زندگی سے فرار کے لیے نہیں تھیں، بلکہ ان کا مقصد انسان کی باطنی تربیت اور معاشرے کی اصلاح تھا۔ اس لیے نوجوان کو چاہیے کہ وہ بزرگوں کی روح، یعنی عشق و عمل، کو اپنائے، نہ کہ ان کے نام پر بے عملی اختیار کرے۔

مکالمے کی ادبی و فکری اہمیت

اس مکالمے کی ادبی اہمیت یہ ہے کہ اقبال نے خشک فلسفیانہ مسئلے، یعنی جبر و قدر کے سوال، کو زندہ کرداروں کی گفتگو میں ڈھال دیا ہے۔ سید ہجویر جیسی تاریخی و روحانی شخصیت کے منہ سے جواب دلوانا اس لیے بھی مؤثر ہے کہ وہ تصوف کی مستند آواز ہیں؛ جب وہی عمل و خودی کی تلقین کرتے ہیں تو تصوف کے بارے میں یہ غلط فہمی دور ہو جاتی ہے کہ صوفی دنیا سے کٹا ہوا ہوتا ہے۔ فکری اعتبار سے یہ مکالمہ اقبال کے اس اصول کو واضح کرتا ہے کہ تقدیر خودی کے تابع ہے اور قوموں کی قسمت ان کے اپنے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ آج کا نوجوان بھی انہی سوالات کا سامنا کرتا ہے، اس لیے یہ مکالمہ ہر دور میں تازہ رہتا ہے۔

حاصلِ کلام

حاصلِ کلام یہ ہے کہ نوجوان کی شکایت قوم کے زوال، تقدیر کی الجھن اور بے عملی کی مایوسی پر مبنی تھی، اور سید ہجویر نے اس کا جواب یہ دیا کہ تقدیر انسان کی خودی اور عمل کے ساتھ جڑی ہے، شکایت کے بجائے عشق، معرفت اور جہدِ مسلسل ہی نجات کی راہ ہے۔ اقبال نے اس تمثیل سے نوجوان نسل کو یہ پیغام دیا ہے کہ بزرگوں سے رہنمائی لینے کا مطلب ان کے پیغام کو عملی زندگی میں اپنانا ہے۔ جو نوجوان اس جواب کو سمجھ لے، اس کی شکایت شکوے سے نکل کر عمل کی تحریک میں بدل جاتی ہے، اور یہی جاوید نامہ کا اصل مقصد ہے۔

اس مکالمے کی ایک اضافی اہمیت یہ بھی ہے کہ یہ آج کے نوجوان کے سوالات کا آئینہ ہے۔ آج کا نوجوان بھی یہی پوچھتا ہے کہ محنت کے باوجود کامیابی کیوں نہیں ملتی، نظام کی خرابی میں فرد کی کوشش کا کیا مقام ہے، اور مذہب اسے دنیا کی دوڑ میں پیچھے تو نہیں کر دیتا؟ سید ہجویر کے جواب کی روشنی میں ان سوالوں کا حل یہ نکلتا ہے کہ فرد کو پہلے اپنے باطن کی اصلاح کرنی ہے، کیونکہ قومیں افراد سے بنتی ہیں اور نظام بھی بالآخر انسانوں کے کردار کا عکس ہوتا ہے۔ اقبال نے یہ مکالمہ اس لیے بھی ایک بزرگِ دین سے منسوب کیا تاکہ نوجوان کو معلوم ہو کہ دین کی اصل تعلیم مایوسی نہیں، امید و عمل ہے۔ خانقاہ کی روایت کو اقبال نے رد نہیں کیا؛ انہوں نے اسے اس کے اصل مقصد، یعنی تربیتِ باطن، کی طرف لوٹانے کی کوشش کی ہے۔ اس نکتے کو جواب میں شامل کرنے سے طالب علم کا نوٹ محض کتابی خلاصہ نہیں رہتا، بلکہ عصری زندگی سے جڑا ہوا تجزیہ بن جاتا ہے، اور سید ہجویر و اقبال دونوں کے پیغام کی ہم آہنگی بھی واضح ہو جاتی ہے۔

مزید وضاحت: اس مکالمے کا آج کے نوجوان سے تعلق

سوال نمبر 4: مختصر نوٹ -- عشق و عقل کا مقابلہ اور عظمتِ آدم (20 نمبر)

سوال نمبر 4۔ مختصر نوٹ تحریر کیجیے۔ 1۔ "عشق و عقل کا مقابلہ" 2۔ "عظمتِ آدم" (20)

تعارف

اقبال کی فکر میں عشق و عقل کا مقابلہ اور انسان کی عظمت دو ایسے مرکزی موضوعات ہیں جو ان کی اردو و فارسی شاعری میں بار بار آتے ہیں۔ عقل و عشق کا سوال دراصل زندگی کو سمجھنے کے دو طریقوں کا سوال ہے، جبکہ عظمتِ آدم کا تصور انسان کے مقام و مرتبے سے متعلق ہے۔ ذیل میں دونوں موضوعات پر الگ الگ مختصر نوٹ پیش کیے جاتے ہیں اور آخر میں ایک موازناتی جدول کے ذریعے عشق و عقل کے فرق کو واضح کیا جاتا ہے۔

نوٹ 1: عشق و عقل کا مقابلہ

اقبال کے ہاں عقل سے مراد وہ محدود، حساب کتاب کرنے والی اور ظاہری اسباب تک محدود سوچ ہے جو ہر قدم پر خطرے کا اندازہ لگاتی اور مصلحت کی قید میں رہتی ہے، جبکہ عشق سے مراد وہ جذبۂ ایثار و جستجو ہے جو محبوب کی خاطر ہر خطرہ مول لیتا ہے اور منزل تک پہنچ کر دم لیتا ہے۔ اقبال کا مشہور تصور ہے کہ عقل انسان کو راہ دکھاتی ضرور ہے، مگر اسے منزل تک نہیں پہنچاتی؛ عقل کنارے پر کھڑی تماشا دیکھتی ہے، جبکہ عشق دریا میں کود جاتا ہے۔ یہ مقابلہ دراصل اس لیے ہے کہ اقبال مسلمان کی زندگی میں اس جمود کو توڑنا چاہتے تھے جو محض مصلحت کوشی اور ڈر کی وجہ سے پیدا ہو گیا تھا۔

البتہ یہ سمجھنا غلط ہو گا کہ اقبال عقل کے مخالف ہیں۔ وہ عقل کو ضروری سمجھتے ہیں، مگر اسے عشق کی رہنمائی میں رکھنا چاہتے ہیں۔ ان کے نزدیک عقل جب عشق سے جدا ہوتی ہے تو مکر و فریب اور مادہ پرستی بن جاتی ہے، جیسا کہ مغربی تہذیب میں ہوا، اور عشق جب عقل سے جدا ہوتا ہے تو بے راہ روی کا شکار ہوتا ہے۔ کامل انسان وہ ہے جس میں عقل کی بصیرت اور عشق کا جوش دونوں جمع ہوں۔ اسی امتزاج کا نام اقبال کے ہاں مردِ مومن ہے۔ جاوید نامہ اور اسرار و رموز میں کئی مقامات پر عقل و عشق کے مکالمے اور تقابل سے یہی نکتہ واضح کیا گیا ہے کہ زندگی کی گاڑی کے دو پہیے یہی ہیں، مگر قیادت عشق کی ہونی چاہیے۔

جدول: عشق و عقل کا موازنہ (اقبال کی فکر کی روشنی میں)

پہلو	عقل	عشق
طبیعت	محتاط، حساب کرنے والی، مصلحت پسند	بے باک، ایثار کرنے والی، خطرہ مول لینے والی
کام	راہ کی نشان دہی اور اسباب کی تلاش	منزل تک پہنچانا اور عمل پر آمادہ کرنا
حد	ظاہر تک محدود، شک میں مبتلا	باطن تک رسائی، یقین سے سرشار
نتیجہ (تنہا ہو تو)	جمود، مادہ پرستی یا مکر و فریب	بے راہ روی کا امکان

قیادت و رہنمائی کا اصل حقدار	عشق کی رہنمائی میں کارآمد	اقبال کی تجویز

نوٹ 2: عظمتِ آدم

عظمتِ آدم اقبال کی فکر کا دوسرا بنیادی ستون ہے۔ قرآن کریم نے انسان کو خلیفۃ اللہ، مسجودِ ملائک اور احسنِ تقویم کہہ کر اس کی عظمت بیان کی ہے، اور اقبال نے اسی قرآنی تصور کو اپنی شاعری کا مرکز بنایا ہے۔ ان کے نزدیک انسان مٹی کا پتلا نہیں، بلکہ کائنات کی سب سے قیمتی ہستی ہے جس میں خودی کا جوہر رکھا گیا ہے۔ فرشتے بے اختیار اطاعت کرتے ہیں، مگر انسان کو اختیار دیا گیا ہے، اسی اختیار نے اسے اشرف المخلوقات بنایا ہے۔ اقبال کہتے ہیں کہ عروجِ آدمِ خاکی سے ستارے بھی سہم جاتے ہیں، کیونکہ انسان میں وہ صلاحیت ہے کہ وہ کائنات کو مسخر کرے اور خلافت کا حق ادا کرے۔

عظمتِ آدم کا مطلب یہ نہیں کہ انسان مغرور ہو جائے؛ اقبال کے نزدیک یہ عظمت خودی کی پہچان، عشقِ الٰہی اور خدمتِ خلق سے مشروط ہے۔ جو انسان اپنی خودی کو ضائع کر کے غلامی، تقلید اور بے عملی میں پڑ جاتا ہے، وہ آدم کی عظمت سے محروم ہو جاتا ہے، خواہ اسے دنیا کی نعمتیں میسر ہوں۔ اسی لیے اقبال انسان کو شاہین سے تشبیہ دیتے ہیں جو بلندی، آزادی اور خودداری کی علامت ہے۔ عظمتِ آدم کا یہ تصور جدید انسان کے اس احساسِ کمتری کا علاج ہے جو سائنس اور مادہ پرستی نے پیدا کیا ہے۔ اقبال انسان کو اس کا بھولا ہوا مقام یاد دلاتے ہیں تاکہ وہ اپنی تعمیر خود کرے اور فرشتوں سے آگے بڑھنے کی ہمت پیدا کرے۔

حاصلِ کلام

حاصلِ کلام یہ ہے کہ عشق و عقل کے مقابلے میں اقبال عشق کو قیادت دیتے ہیں مگر عقل کو رد نہیں کرتے، اور عظمتِ آدم کے تصور میں وہ انسان کو کائنات کا مرکز و محور قرار دیتے ہیں بشرطیکہ وہ اپنی خودی کو پہچانے۔ دونوں تصورات ایک دوسرے سے جڑے ہیں: آدم کی عظمت اسی وقت ظاہر ہوتی ہے جب عشق اس کا رہنما ہو اور عقل اس کی

خادم۔ان دونوٹوں کا مطالعہ اقبال کی فارسی وار دو شاعری کے بیشتر بڑے موضوعات کو سمجھنے کی کلید ہے، کیونکہ مردِ مومن دراصل وہی انسان ہے جس میں عشق کا جوش اور آدم کی عظمت دونوں جمع ہو گئے ہوں۔

عشق و عقل اور عظمتِ آدم کے باہمی رشتے کو مزید واضح کرنا بھی ضروری ہے۔اقبال کے نظام میں عظمتِ آدم کا دارومدار اسی پر ہے کہ انسان عقل کو عشق کی ماتحتی میں استعمال کرے۔ تاریخ گواہ ہے کہ جب انسان نے عقل کو عشق و اخلاق سے الگ کیا تو اس نے ایٹم بم اور استعمار پیدا کیا، اور جب عشق نے عقل کا ساتھ چھوڑا تو خرافات اور جمود پیدا ہوا۔ اقبال کا انسان ان دونوں انتہاؤں سے بچا ہوا ہے؛ وہ محقق بھی ہے اور عاشق بھی—وہ کائنات کو عقل سے مسخر کرتا ہے اور اس تسخیر کو عشق کے ذریعے انسانیت کی خدمت میں لگاتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ عظمتِ آدم محض فلسفیانہ دعویٰ نہیں، بلکہ ایک عملی پروگرام ہے جس میں تعلیم، تحقیق، اخلاق اور روحانیت سب شامل ہیں۔ فرشتوں پر انسان کی فضیلت بھی اسی بنیاد پر ہے کہ فرشتہ مجبورِ اطاعت ہے جبکہ انسان مختار ہے اور اپنی مرضی سے نیکی اختیار کرتا ہے۔اس وضاحت کے بعد دونوں نوٹ ایک ہی حقیقت کے دو رخ محسوس ہوتے ہیں: عشق و عقل اس حقیقت کا ذریعہ ہیں اور عظمتِ آدم اس کا حاصل۔

مزید وضاحت: دونوں تصورات کا باہمی رشتہ

سوال نمبر 5: "پیام بہ جوانان" اور اقبال کی نوجوانوں سے توقعات (20 نمبر)

سوال نمبر 5۔"پیام بہ جوانان" کے حوالے سے بحث کرتے ہوئے بتایئے کہ اقبال نوجوانوں سے کیا چاہتے تھے؟(20)

تعارف

اقبال نے اپنی شاعری کا سب سے بڑا مخاطب نوجوان کو بنایا ہے۔"پیام بہ جوانان" اسی سلسلے کی اہم نظم و پیغام ہے جس میں اقبال نے نوجوان نسل کو براہِ راست مخاطب کر کے اس کی ذمہ داریاں بیان کی ہیں۔اقبال کا عقیدہ تھا کہ قوموں کی قسمت بوڑھے نہیں بناتے، نوجوان بناتے ہیں؛ بزرگ تجربہ دے سکتے ہیں، مگر تبدیلی کی طاقت، جوش اور قربانی کا

جذبہ جوانی ہی میں ہوتا ہے۔اس سوال میں پیام بہ جوانان کے مرکزی نکات کی روشنی میں یہ بحث کی جاتی ہے کہ اقبال نوجوانوں سے دراصل کیا چاہتے تھے اور آج کے نوجوان کے لیے اس پیغام کی کیا اہمیت ہے۔

خودی کی پہچان اور حفاظت

اقبال نوجوانوں سے سب سے پہلے یہ چاہتے تھے کہ وہ اپنی خودی کو پہچانیں اور اس کی حفاظت کریں۔خودی سے مراد اپنی ذات، اپنی صلاحیتوں اور اپنے مقصدِ حیات کی معرفت ہے۔جو نوجوان خود کو نہیں پہچانتا، وہ دوسروں کی تقلید میں زندگی گزارتا ہے اور غلامی کو آزادی سمجھتا رہتا ہے۔اقبال نے نوجوان کو شاہین سے تشبیہ دی، جو نہ آشیانہ بناتا ہے، نہ دوسروں کے مارے ہوئے شکار پر گزر کرتا ہے اور نہ غلامی کی فضا میں جینا پسند کرتا ہے۔پیام بہ جوانان میں یہ یقین ملقین ہے کہ نوجوان اپنی خودی کو اتنا مضبوط کرے کہ تقدیر خود اس سے پوچھے کہ تیری رضا کیا ہے۔اس کے لیے محنت، سادگی، خودداری اور مستقل مزاجی بنیادی شرائط ہیں، جبکہ عیش کوشی اور آسائش پسندی خودی کی قاتل ہیں۔

علم کے ساتھ عمل اور کردار

اقبال نوجوانوں سے دوسری بڑی توقع علم کے ساتھ عمل اور کردار کی رکھتے تھے۔وہ ایسے علم کے قائل نہیں تھے جو صرف کتابوں میں بند ہو اور زندگی میں اس کا کوئی عکس نظر نہ آئے۔ان کے نزدیک نوجوان کو جدید علوم ضرور حاصل کرنے چاہئیں، مگر اپنی تہذیب، دین اور اقدار سے کٹ کر نہیں۔مغرب سے علم لینا برا نہیں، مغرب کی غلامانہ تقلید بری ہے۔پیام بہ جوانان میں اقبال نے نوجوان کو خبردار کیا ہے کہ نرم نازک زندگی، فیشن اور عیش اسے اس مقصد سے غافل نہ کر دیں جس کے لیے قومیں زندہ رہتی ہیں۔سچائی، امانت، جرات اور ایثار جیسا کردار ہی نوجوان کی اصل ڈگری ہے، اور اسی کردار سے قوموں کی قیادت پیدا ہوتی ہے، محض اسناد سے نہیں۔

عشقِ رسول اور ملت سے وابستگی

اقبال نوجوانوں سے یہ بھی چاہتے تھے کہ وہ عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی زندگی کا مرکز بنائیں اور ملتِ اسلامیہ سے اپنا رشتہ مضبوط رکھیں۔ان کے نزدیک رسولِ اکرم کی ذات مسلمان نوجوان کے لیے کامل نمونہ ہے، اور اسی نمونے کی پیروی سے خودی کو وہ مرکز ملتا ہے جس کے بغیر وہ منتشر رہتی ہے۔پیام بہ جوانان میں اقبال نے نوجوان کو یاد

دلایا ہے کہ اس کی میراث کوئی معمولی چیز نہیں؛ وہ ان بزرگوں کا وارث ہے جنہوں نے علم، جہاد اور کردار سے دنیا کی قیادت کی تھی۔ یہ وابستگی تعصب نہیں، بلکہ اپنی شناخت کی حفاظت ہے، تاکہ نوجوان عالمی سطح پر بھی اعتماد کے ساتھ کھڑا ہو سکے اور دوسری اقوام کی محکومیت کے بجائے برابری کی سطح پر بات کر سکے۔

حرکت، جستجو اور مایوسی سے نجات

اقبال نوجوانوں سے حرکت اور جستجو چاہتے تھے اور مایوسی کو ان کے لیے سب سے بڑا گناہ سمجھتے تھے۔ ان کے فلسفے میں زندگی کا مفہوم ہی مسلسل کوشش ہے؛ ساحل پر ٹھہر جانا موت ہے اور موج کی طرح رواں رہنا زندگی۔ نوجوان اگر ناکامی سے گھبرا کر بیٹھ جائے تو قوم کا مستقبل تاریک ہو جاتا ہے، اور اگر وہ ہر ناکامی کو نئی کوشش کا زینہ بنائے تو کوئی طاقت اسے روک نہیں سکتی۔ اقبال نے نوجوان کو ستاروں پر کمند ڈالنے، یعنی ناممکن کو ممکن بنانے کی جو درس دیا ہے۔ پیام یہ جوانان کا لبِ لباب یہی ہے کہ نوجوان زمانے کی شکایت کرنے کے بجائے خود زمانے کو بدلنے کی تیاری کرے، کیونکہ زمانہ انہی کا ساتھ دیتا ہے جو اسے بدلنے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔

حاصلِ کلام

حاصلِ کلام یہ ہے کہ اقبال نوجوانوں سے خودی کی پہچان، علم کے ساتھ عمل و کردار، عشقِ رسول اور ملت سے وابستگی، اور حرکت و جستجو سے بھرپور زندگی چاہتے تھے۔ پیام بہ جوانان دراصل اقبال کے پورے فلسفے کا نوجوان نسل کے لیے خلاصہ ہے۔ آج کا نوجوان بھی بے روزگاری، تقلید اور مایوسی جیسے مسائل میں گھرا ہے، اس لیے اقبال کا یہ پیغام آج بھی اسی طرح تازہ ہے جیسے اس کے لکھے جانے کے وقت تھا۔ جو نوجوان اس پیغام کو اپنا لے، وہ محض اپنی زندگی نہیں سنوارتا، بلکہ اپنی قوم کے مستقبل کی تعمیر کا ذریعہ بھی بن جاتا ہے۔

مزید وضاحت: عملی زندگی میں اس پیغام کا اطلاق

پیام بہ جوانان کی بحث کو مکمل کرنے کے لیے اس کے عملی اطلاق پر بھی نظر ڈالنی چاہیے۔ آج کا نوجوان سوشل میڈیا کی چمک، بے روزگاری کے دباؤ اور تقلید کی دوڑ میں اپنی خودی سے غافل ہو رہا ہے۔ اقبال کا پیغام اسے کہتا ہے کہ پہلے اپنے اندر وہ مرکز پیدا کرو جس کی بنیاد ایمان اور کردار ہو، پھر جدید علم و ہنر کو اسی مرکز کے تابع کر کے حاصل

کرو۔ عملی طور پر اس کا مطلب ہے وقت کی قدر، مطالعے کی عادت، استاد کا احترام، جھوٹی نمائش سے پرہیز اور چھوٹے کام کو بھی دیانت سے کرنا۔ اقبال نوجوان سے دنیا چھوڑنے کو نہیں کہتے؛ وہ اسے دنیا کو بدلنے کی تیاری کا کہتے ہیں۔ ان کے نزدیک نوجوان کی نماز، اس کا مطالعہ، اس کی محنت اور اس کی قوم دوستی سب ایک ہی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔ جو نوجوان اس وحدت کو پالیتا ہے، اس کی زندگی میں [illegible] ہے نہ انتشار۔ اسی لیے پیام بہ جوانان کو محض ایک نظم نہیں، بلکہ نوجوان نسل کے لیے اقبال کا منشور قرار دیا جا سکتا ہے، اور اسی منشور پر عمل قوم کی تقدیر بدل سکتا ہے۔

USMAN NOTES www.usmannotes.com